مقتلِ غوری

از

لیفٹننٹ کرنل جناب خواجہ عبدالرشید صاحب

(پی۔اے۔ایم۔سی، پی۔ایس۔سی)

سلطان معزالدین بہاء الدین محمد سام الملقب بشہاب الدین غوری کی شہادت سے متعلق ہماری معلومات کا دارومدار زیادہ تر طبقات ناصری اور تاریخ فرشتہ پر ہے۔ فرشتہ کا ماخذ بھی طبقات ہی ہے۔ ہمیں پہلی مرتبہ یہ طبقات ہی سے پتہ چلتا ہے کہ سلطان غوری کا مقامِ شہادت دمیک ہے۔ اگرچہ اس مقام کا تعین کسی بھی مورخ نے نہیں کیا۔ اس ضمن میں فرشتہ کی عبارت یہ ہے :-

"چوں در خاطر ہمایوں ماغزائے کفارِ ترکستان مرکوز گشتہ است باید بہ مجرد وصول فرمان لشکرآں حدود را جمع آوردہ، برکنار آب جیحوں نزول نماید و پُل مہیا دارد، تا سپاہِ اسلام در وقت عبور آزار نکشند وچوں سلطان بتاریخ دوئم شعبان سال مذکور بکنار آب نیلاب رسید و در منزلیکہ برمہیک (یہ دھمیک ہوگا۔ کاتب نے غلطی سے ایسا لکھ دیا ہے) اشتہار داشت فرود آمد، قضارا دراں چند روز بیست نفر از کفار کہکران کہ اکثر خویشان و اقرباو فرزندان ایشاں در جنگ سلطان شہاب الدین کشتہ شدہ بودند ہم عہد و ہم سوگند شدہ و کشتہ شدن رخود قرار دادن درباب کشتن سلطان شہاب الدین تدبیر ہا جستند۔"

یہ بیان کرنے کے بعد فرشتہ لکھتا ہے

"بتاریخ بیست و دوئم شہر شعبان محفہ سلطان شہاب الدین را بہ غزنین رسانیدہ خطیرۂ کہ برائے دختر خود ساختہ بود دفن کردند۔"[1]

---

[1] تاریخ فرشتہ مطبوعہ نول کشور فارسی جلد اول ص ۶۰

صاحب طبقات ناصری کا بیان ہے۔

"دراں وقت جماعت متمردان از کوکھران[1] وقبائل کوہ جودعصیان آوردہ بودند و سلطان دراں زمستان بہ ہندوستان آمد واں طائفہ متمردان را بدوزخ فرستاد ... چوں مراجعت بہ غزنین کرد بدست فدائے ملاحدہ در منزل دمیک در شہور سنہ اثنین و ستمائہ شہادت یافت و یکے از فضلائے آں وقت دریں معنی نظمی کردہ است تحریر افتاد و در نظر بادشاہ مسلمان آید"

شہادت ملک بحروبر معز الدین | کز ابتدائی جہاں شہ چو او نیامد یک
سوم زغرہ شعبان بسال ششصد و دو | فتاد در راہ غزنین بمنزل دمیک[2]

ان اقتباسات سے ہمیں چند معلومات بہم پہنچتی ہیں:۔

(۱) سلطان کی مراجعت غزنین کے وقت یہ حادثہ پیش آیا۔

(۲) سلطان کھوکھروں کو سر کرنے ہندوستان آیا ہوا تھا اور انھیں ٹھکانے لگا کر واپس جارہا تھا۔

(۳) کھوکھر زخم خوردہ تھے اور خون کے پیاسے۔

(۴) سلطان نے دریائے جیحوں پر پل بنانے کو کہا کہ سپاہ اسلام عبور کر سکے۔

(۵) سلطان دریائے نیلاب پر پہنچا تو بہ مقام دمیک اُسے شہید کر دیا گیا۔

(۶) سلطان کی شہادت کے بعد اس کی لاش کو غزنین لے جایا گیا۔

(۷) سلطان اپنی دختر کے تجویز کردہ خطیرہ میں مدفون ہوا۔

اور (۸) سلطان کی تاریخ شہادت شعبان مطابق ۶۰۲ ہجری ہے۔

ہمیں آج ان امور کے متعلق کچھ مزید معلومات فراہم کرنا ہے جن کی تفصیل کتب تواریخ میں نہیں ملتی۔ سب سے پہلے ہم اس طرف رجوع کریں گے کہ سلطان شہید کا اصل قاتل کون تھا۔

---

[1] کھوکھران، کوکران، کوکھران، درحقیقت لفظ کھوکھر کی مختلف شکلیں ہیں۔
[2] طبقات ناصری بسعی ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی ص ۳۹ / ۴۰

قاتل سلطان شہید طبقات ناصری کی تحریر سے صاف پتہ چلتا ہے کہ قاتل کھوکھر تھا، مگر فرشتہ نے یہی لفظ کچھ اس انداز میں لکھ دیا ہے کہ بعد کے مورخین کو اس لفظ سے گکھڑ کا اشتباہ ہوگیا ہے، وہ صاف طور پر کھوکھر نہیں لکھتا۔ بلکہ کہکر لکھتا ہے اور یہ لفظ وہ متواتر محمود غزنوی کی مہموں سے ایسا ہی لکھتا چلا آتا ہے۔ چنانچہ لین پول وغیرہ نے بھی ایسا ہی تصور کرلیا ہے کہ سلطان شہید کا قاتل گکھڑ تھا۔[1] ظاہر ہے کہ اس کا ماخذ فرشتہ ہی ہوگا۔ کہ طبقات ناصری سے یہ بات مترشح نہیں ہوتی۔ بدقسمتی سے ہماری کتب تواریخ میں مقاموں اور شخصیتوں کے ناموں میں بڑا ہی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اور اس پر کاتبوں کی ستم ظریفی دیکھئے کہ الفاظ کو اُلٹا سیدھا لکھ کر کیا سے کیا بنا دیتے ہیں۔ بہرحال سلطان شہید کا قاتل گکھڑ نہیں تھا بلکہ کھوکھر ہی تھا۔ اس امر کی وضاحت اب ہم دوسرے نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ جب سلطان شہید کے بڑے بھائی غیاث الدین محمدؒ نے وفات پائی تو اس نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی مصیبتوں کا سامنا کیا۔ سب سے پہلے وسط ایشیا کی بغاوت کا معاملہ تھا۔ جہاں اسے خوارزم شاہ علاؤالدین محمد کے ہاتھوں شکست کھانا پڑی۔ اس شکست سے اس کے وقار کو ہندوستان میں بڑا صدمہ پہنچا۔

چنانچہ ہندوستان میں جگہ جگہ بغاوتیں پھیلنا شروع ہوگئیں۔ خاص طور پر پنجاب میں کھوکھروں کی بغاوت قابلِ ذکر ہے۔ اور سلطان شہید انہی کھوکھروں کو سبق سکھانے کی غرض سے ہندوستان چلا آیا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب وہ انھیں سبق سکھا کر واپس جا رہا تھا تو کسی کھوکھر نے اس پر حملہ کر کے اس کو مقام دمیک کے قریب شہید کر دیا۔ یہ واقعہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ سلطان شہید کا قاتل کھوکھر تھا نہ کہ گکھڑ۔[2]

---

[1] ملاحظہ ہو لین پول سلاطین اسلام (بہ زبان انگریزی) ص ۲۹۴ [2] فرشتہ نے اسی لفظ "کہکر" سے ایک اور غلط فہمی بھی پیدا کر دی ہے اور وہ محمود غزنوی کی ایک مہم کے بارے میں ہے۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ "کہکر" سلطان محمود کے خلاف جے پال کی طرف سے لڑے۔ بعد کے مورخین نے اس لفظ کو گکھڑ پڑھ لیا ہے، حالانکہ جو تعداد ان کی بتائی جاتی ہے اس وقت اس سے گکھڑوں کی موجودہ آبادی دس گنا کم ہے۔ حالانکہ اُسے بہت زیادہ ہونا چاہیئے تھا۔ بہرحال اُس زمانے میں بھی سلطان محمود کے خلاف کھوکھر ہی لڑے نہ کہ گکھڑ۔
(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک بات اور جو اس ضمن میں ہماری نگاہ میں کھٹکتی ہے یہ ہے کہ طبقات اور فرشتہ دونوں قاتل کو ملاحدہ اور کافر بتلا رہے ہیں۔ یہ کھوکھر ہی ہو سکتے ہیں کیوں کہ گکھڑوں نے سلطان محمود کے عہد ہی میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ لہذا قاتل کا گکھڑ ہونا قرینِ قیاس نہیں۔ کھوکھروں نے بہت بعد میں اسلام کا مذہب قبول کیا۔ اس بات کی تصدیق یوں بھی ہو جاتی ہے کہ طبقات ناصری کا مصنف ان قبائل کا علاقہ کوہ جُود بتلاتا ہے۔ یہ کوہ جود آج بھی ضلع جہلم کے وسط میں موجود ہے اور یہ راجپوتوں کا خاص علاقہ ہے، کھوکھر، جنجوعہ اور اعوان اسی علاقہ سے منسوب ہیں۔ اعوان اگرچہ اپنے کو یونانی الاصل بتلاتے ہیں مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ بھی راجپوتوں ہی کی ایک شاخ ہیں۔ بہرحال گکھڑ اس علاقے سے منسوب نہیں ہیں۔ گکھڑوں کا علاقہ شمالی پہاڑی سلسلہ کے ساتھ ساتھ چلتا ہے جو آج کل شاہراہ سوری کے دائیں جانب راولپنڈی کے ضلع تک پھیلا ہوا ہے۔ اور پھر ضلع جہلم میں گکھڑوں کی آبادی ہمیشہ کم رہی ہے ان کی اکثریت ضلع راولپنڈی ہی میں

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

ملاحظہ ہو مصنف مضمون ہذا کا مقالہ بہ عنوان THECAMPAIGNOFHUND مطبوعہ ملٹری ڈائجسٹ بابت اپریل ۱۹۵۵ء

[1] گیگو ہر نامہ فارسی۔ ملاحدہ کے لفظ کے ساتھ طبقات ناصری نے فدائی کا لفظ جڑ دیا ہے، جس سے بعض لوگوں کو یہ اشتباہ ہوا ہے کہ قاتل کرامتی تھا یا حسن بن صباح کا پیرو۔ ہم اس خیال سے متفق نہیں۔ کیونکہ کرامتی ملتان کے گردونواح میں مرکوز تھے، اور سلطان محمود غزنوی نے ان کرامتیوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ غوری کے وقت ان کی طاقت مٹ چکی تھی، اور ان کا اتنا اثر نہ تھا کہ بغاوت پھیلا سکتے۔ حسن بن صباح کے پیرو بہت قلیل تعداد میں تھے اور ان کا وجود پنجاب میں کبھی بھی ثابت نہیں ہوا۔ البتہ چترال اور کافرستان کی پہاڑیوں میں یہ ضرور جاگزیں ہوئے اور آج تک وہاں موجود ہیں۔ ان لوگوں کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ پہاڑی علاقوں ہی میں رہتے تھے، کبھی کھلے بندوں میدانوں میں نہیں اترتے تھے۔ ایران میں بھی ان کا مرکز یا تو کوہ الموت میں رہا ہے یا کردستان کی پہاڑیوں میں یہ اکے دکے رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یہ کوہ ارارط کے گردونواح میں بھی جمع ہو گئے تھے، اس لئے فدائی ملاحدہ کو فدائین اور کرامتی سمجھنا درست نہیں۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی اور وہ کوہ جود کا وقوع ہے۔ اسلامی روایات کے مطابق کوہ جودی طوفان نوح کے قصے کے ساتھ منسوب ہے اور یہ کوہ ارارات کے سلسلے کی ایک پہاڑی ہے، اس کا ہم نام ضلع جہلم میں کیونکر آگیا۔ یہ ایک معمہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو قاتل واقعی ارارات کے سلسلہ کوہستان سے آیا تھا اور کرامتی تھا، یا یہاں بھی ایک ایسا نام رکھ دیا گیا جیسا کہ اکثر ناموں میں تکرار پایا جاتا ہے۔

تھی اور اب بھی ہے۔ کھوکھرا اسی شاہراہ کے جنوب میں واقع ہیں جہاں کوہ جود بھی واقع ہے۔ لیکن کہیں کہیں یہ شاہراہ سوری کے جنوب میں بھی آ گئے ہیں۔ اس طرف گکھڑوں کے فقط چند دیہات ہیں۔ ایک زمانہ میں گکھڑوں نے چناب کے علاقہ تک حکومت کی ہے، مگر ان کے دار الحکومت ضلع راولپنڈی کے قرب وجوار میں ہی رہے ہیں۔

قاتل کے تعین کے بعد اب دریاؤں کی تصدیق کا معاملہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس ضمن میں مورخین نے تین نام استعمال کئے ہیں، لیکن اس خاص واقعہ سے متعلق صرف دو نام آئے ہیں ایک دریائے جیحون اور دوسرا دریائے نیلاب۔ جو بات معمہ بن گئی ہے وہ یہ ہے کیا وجہ ہے کہ مورخین نے جہلم دریا کو اس نام سے یاد نہیں کیا؟ اور اسے جیحون اور نیلاب لکھ دیا ہے، ہماری دانست میں اصل واقعہ یوں ہے کہ جیحون، جہلم کا نام مسلمانوں نے سب سے پہلے رکھا۔ جب مسلمان اس طرف بڑھے تو دو دریا جو ان کو عبور کرنے پڑے وہ سندھ اور جہلم ہی تھے، ان دونوں کو انھوں نے مانوس ناموں سے پکارا یعنی سیحون اور جیحون۔ نیلاب بعض مورخین نے جہلم کے شفاف پانی کو دیکھ کر اس کا نام رکھ دیا۔ مختصر یہ کہ جیحون اور نیلاب، دریائے جہلم ہی کے دو اور نام ہیں۔ اور چونکہ فرشتہ پل کی تعمیر دریائے جیحون پر بتاتا ہے اس لئے یہ جہلم پر ہی بنا ہوگا۔[1]

اب آخری بات جو ہمارے لئے لازمی معلوم ہوتی ہے وہ تعین مقام دمیک ہے تاکہ تحقیق میں تطبیق پیدا ہو جائے۔

ہمیں بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان مورخین نے جغرافیائی مقامات اور دیگر مقاموں کے ناموں میں بڑی بے احتیاطی برتی ہے۔ نہ صرف انھیں غلط لکھ دیا گیا ہے بلکہ ان کی جائے وقوع بھی بغیر تصدیق کے لکھ دی گئی ہے جس سے تاریخی واقعات اور حقایق میں بڑی پریشانی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک محقق طالب علم کے لئے کسی طرح بھی یہ ممکن نہیں کہ وہ حملہ آوروں

---

[1] یہ پل پار کر کے سلطان شہید مقام دمیک پر پہنچتا۔ لیکن یہاں پہنچنے کے لئے فرشتہ پھر لکھتا ہے کہ سلطان شہید کو آب نیلاب کے کنارے پہنچنا پڑا تاکہ اسے عبور کرے لہذا یہ امر بھی تصدیق ہو گیا کہ نیلاب اور جہلم ایک ہی دریا ہے اور اسے عبور کر کے سلطان شہید مقام دمیک پہنچتا ہے۔ چنانچہ مقام دمیک جہلم کے کنارے ہی ہونا چاہیئے۔ اب اس مقام کا محل وقوع اوپر ملاحظہ فرمایئے۔

کی نقل و حرکت کو بخوبی سمجھ سکے۔[1] خیر یہ ایک علیحدہ موضوع ہے، اس وقت ہمیں صرف تعین مقام دمیک پر روشنی ڈالنا ہے اور ہم اسے بیان کرتے ہیں۔ ذیل کے نقشے کو اول بغور دیکھ لیا جائے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

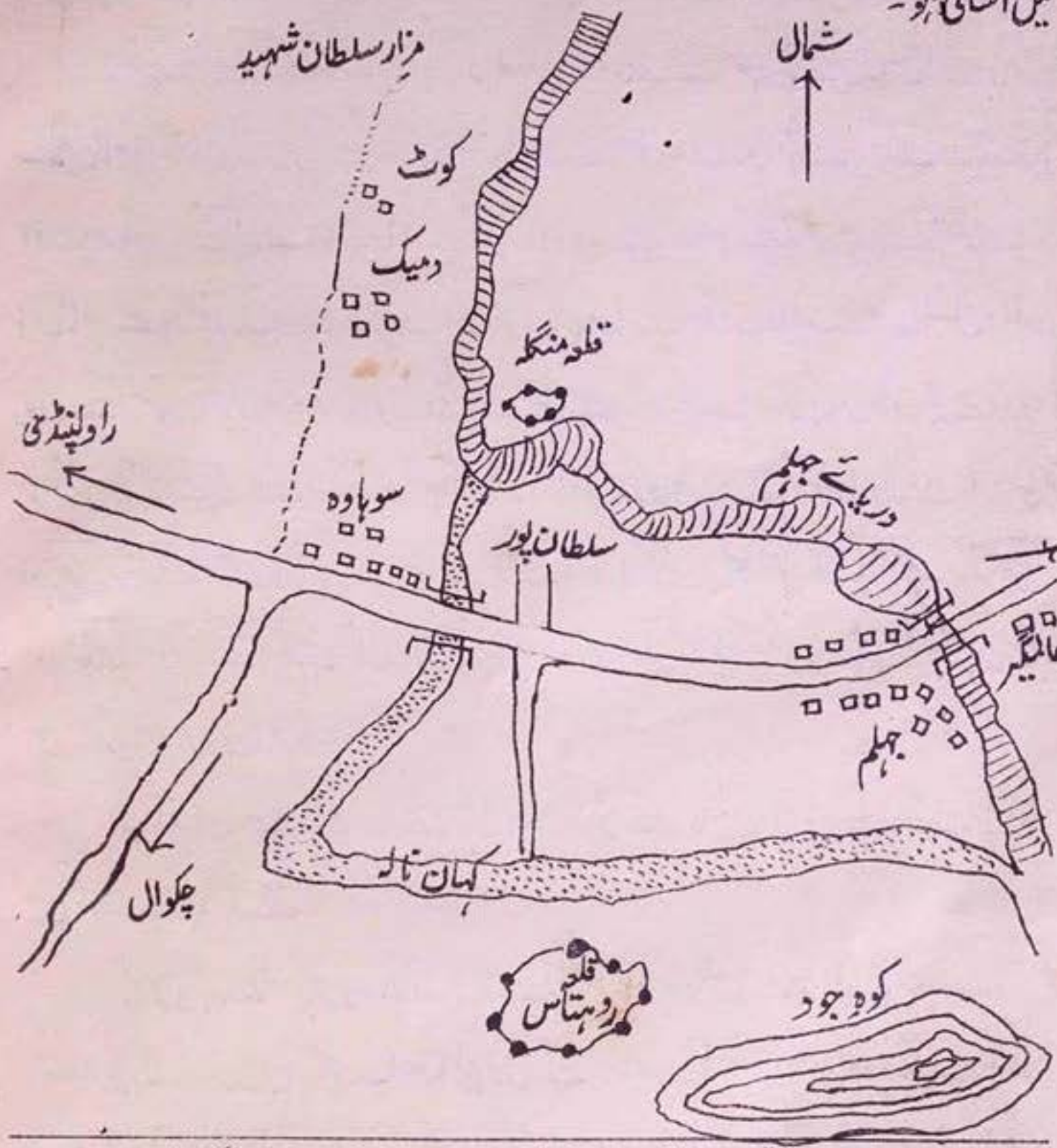

---

[1] اس موضوع پر ہمارا ایک تحقیقی مقالہ گذشتہ سال پاکستان تاریخی کانفرنس میں پڑھا گیا۔ جو کہ MILITARY DIGEST (ملٹری ڈائجیسٹ) بابت اپریل ۱۹۵۶ء اور "الاسلام" (انگریزی) کراچی نے اپنی وسط نومبر ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں نقل کیا ہے۔ اس مقالہ کا عنوان ہے THE CAMPAIGN OF HYND یہ محمود غزنوی کی ابتدائی مہموں سے متعلق ہے، اور اس میں چند ایک مقامات کا صحیح تعین کیا گیا ہے مثلاً لاہور، اور ہاطیبہ، اور مقامات کے غلط تعین یا ان کا غلط نام لکھ جانے سے جو مشکلات واقع ہو گئی ہیں اُن پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

شہر جہلم سے راولپنڈی جاتے ہوئے تقریباً ۲۷ میل کے فاصلے پر چکوال کی طرف ایک نئی سڑک مقام سوہاوہ سے ایک میل آگے نکالی گئی ہے۔ یہ سڑک شاہراہ سوری سے جنوب کی طرف جاتی ہے اس مقام کے دوسری طرف یعنی شمال کی جانب ایک ٹوٹی ہوئی کچی سڑک ہے جسے اگر پگ ڈنڈی کہا جائے تو بہتر ہے۔ یہ راستہ نہایت دشوار گذار ہے اور صرف پیدل یا گھوڑوں پر چلنے کے قابل ہے۔ لیکن ایک اچھا جیپ گاڑی چلانے والا ادھر جیپ لے جا سکتا ہے۔ اس کچی سڑک پر کوئی چار میل کے فاصلے پر شاہراہ سوری سے دمیک کا مقام ہے۔ اس مقام سے دو فرلانگ کے فاصلے پر شمال مشرق کی طرف ایک اور چھوٹا سا گاؤں ہے جسے کوٹ کہتے ہیں۔

مقتل غوری کی وجہ تسمیہ | یہ موضع کوٹ کسی زمانے میں مقام دمیک ہی کا حصہ تھا۔ یہاں پر کھدائی کے وقت آج بھی پرانے آثار ملتے ہیں جن سے اینٹیں نکال کر گاؤں والے تازے مکان تعمیر کرتے رہتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہاں پر ایک قلعہ ہوا کرتا تھا، مگر اب اس کا کوئی ظاہری نشان موجود نہیں۔ دمیک کے نام کی جو وجہ تسمیہ بتائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں ایک قوم زمانہ قدیم سے بستی ہے جس کا نام دھمیال ہے۔ اس قوم کے کچھ افراد اب بھی یہاں موجود ہیں۔ یہ راجپوت ہیں اور زراعت پیشہ ہیں۔ اس نسل میں ایک بادشاہ ہوا ہے جس کا نام راجہ دھمی بتایا جاتا ہے۔ یہ زمانہ تغلقوں کا بتایا جاتا ہے، موضع کوٹ بھی اس کی راجدھانی میں شامل تھا۔ اور ایک وقت میں یہ دونوں مقام ایک ہی نام سے منسوب تھے یعنی دھمی کوٹ، یہی لفظ بدلتے بدلتے دھمک مشہور ہوا، اور بعدہ دھمیک بن گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ راجہ دھمی محمود غزنوی کے زمانہ میں ہوا ہے۔ بہرحال ہم اس بات کی تصدیق نہیں کر سکتے کہ دھمی راجہ کون سے زمانہ میں تھا۔ یہ تمام مقامی روایات ہیں جو ہم نے بیان کر دی ہیں۔

اب اس مقام دھمیک (دمیک کو اب ہم آئندہ دھمیک ہی لکھیں گے) سے اگر کچھ اور شمال مشرق کی طرف بڑھا جائے تو تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر ایک پرخطر وادی سے ہوتے ہوئے ہم ایک میدان میں داخل ہوتے ہیں جس کے کنارے تین بیری کے درختوں کے تلے ایک

چبوترے پر ایک قبر کا نشان ہے۔ یہ راستہ صرف پیدل ہی عبور ہو سکتا ہے یا گھوڑے پر۔ یہ مقام جہاں یہ مزار واقع ہے یہاں سے دریائے جہلم دس میل کے فاصلے پر بہ سمت مشرق واقع ہے۔ اور تقریباً دھمیک سے بھی دریا کا اتنا ہی فاصلہ ہے۔ یہ مزار سلطان شہید کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔[1]

اگرچہ مورخین نے سلطان شہید کا مدفن غزنین قرار دیا ہے تاہم یہ مزار بھی توجہ کے قابل ہے ہمیں حال ہی میں یہاں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہاں پر ایک سفید ریش بزرگ جو اس قبر کی دیکھ بھال (فی سبیل اللہ کرتے ہیں) سے ملاقات کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے ایک عجیب و غریب داستان سنائی۔ ان بزرگ کی عمر کوئی ساٹھ برس سے اوپر ہی ہوگی اور ایک مدت سے وہ اس مزار کی خبر گیری کر رہے ہیں۔ یہاں آمد و رفت بہت کم ہے، اس لئے کوئی مالی لالچ اس خدمت کا محرک نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے ہی یہ بتایا کہ یہ سلطان شہید کا مرقد ہے اور یہ انھوں نے اپنے دادا سے سن رکھا تھا۔ ایک روز کا واقعہ بیان کرتے لگے، کہ انھوں نے ایک خواب دیکھا۔ کہ جس طرح وہ قبر کے چبوترے کی مشرقی دیوار کے ساتھ کھڑے ہیں اور چبوترے کے اندر ایک دالان نمودار ہو گیا ہے۔ جس میں متعدد دروازے ہیں، ایک دروازے سے ایک نوجوان سفید کپڑے پہنے ہوئے نکلتا ہے اور اس بزرگ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ تم میری دیکھ بھال نہیں کرتے، تمہیں چاہیئے کہ میری قبر کھود کر اسے درست کرو۔ اور جاتے جاتے ساتھ یہ بھی کہہ گیا کہ مجھے ایک مُرغ چاہیئے! چنانچہ اس سفید ریش بزرگ نے دوسرے ہی روز چبوترے کو کھودنا شروع کیا۔ قبر کا تعویذ معدوم ہو چکا تھا اور اصل نشان نہیں ملتا تھا، اور تمام چبوترہ قبر کی تلاش میں

---

[1] ہم اس مزار کو یہاں بیان نہ کرتے، مگر چند دلچسپ واقعات اس کی طرف منسوب ہیں جن کی تفصیل بتلانا یہاں مقصود ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کا صرف تصدیق کے بعد ہی پتہ چل سکتا ہے مگر اس کا وقوع دھمیک کے قرب و جوار میں جہاں مقتل غوری ہے خالی از دلچسپی نہیں۔ ساتویں ہجری میں دریا یقیناً یہاں سے بہت قریب ہوگا، ممکن ہے اس وقت فاصلہ دو چار ہی میل ہو۔

کھود ڈالنا پڑا۔ بڑی جستجو کے بعد قبر ملی اور قبر کے اندر سے ڈھانچے کی ہڈیاں نمودار ہوئیں، تمام بدن کی ہڈیاں موجود تھیں مگر سر غایب تھا! اس بزرگ نے ہڈیوں کو از سر نو شرعی تہذیب کے مطابق دفن کر دیا اور قبر پر کر کے اس پر لیپائی کر کے پرانی اینٹیں چن دیں۔ دوسرے روز ایک مرغ پکا کر ختم قرآن کروایا۔ چبوترے کی بھی مرمت کی۔ اس وقت قبر پہ کوئی گنبد وغیرہ نہیں۔ صرف چبوترے پر تین بیری کے درخت ہیں۔ ارد گرد کچھ آثار موجود ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ مقبرہ ضرور ایک باغ کے ساتھ منسلک ہوگا۔ کہتے ہیں کہ سکھوں کے زمانے میں یہ منہدم ہوگیا۔ دلچسپ بات جو بیان کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ پیشتر کہ یہ بزرگ مجھ سے اپنا خواب بیان کرتے میں نے خود ان سے پوچھا کہ یہ قبر تو تازی بنائی ہوئی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ مٹی کا لیپ جو اس پر تھا وہ تازہ نظر آرہا ہے، انھوں نے فوراً کہا کہ یہ درست ہے اور میں نے ہی یہ قبر کھود کر از سرِ نو بنائی ہے! پھر اپنا خواب بیان کیا جو بالا میں درج کر دیا گیا ہے۔ یہ بزرگ یہاں کے نہ تو متولی ہیں اور نہ ہی مجاور ہیں۔ پاس ہی ایک گاؤں میں رہتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے چلتے وقت انھیں کچھ پیسے دینے چاہے یہ سمجھ کر کہ شاید یہ یہاں مجاوری کرتے ہیں مگر انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ہمارے لئے یہ ایک عجیب بات تھی جو غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آئی۔

یہ واقعہ ہم نے اس لئے یہاں بیان کر دیا ہے کہ اول تو مورخین میں سے صرف ایک فرشتہ نے ہی یہ کہا کہ سلطان شہید کی لاش کو غزنین لے جا کر دفنایا گیا۔ دیگر مورخین اس بات پر روشنی نہیں ڈالتے کہ ان کا مدفن کہاں ہے، فرشتہ کا ماخذ طبقات ناصری ہے، مگر وہ اس بارے میں خاموش ہے۔ نہ معلوم یہ روایت فرشتہ کے ہاتھ کہاں سے لگ گئی۔ فرشتہ خود یقیناً دھمیک نہیں آیا ورنہ اس کا کچھ نہ کچھ محلِ وقوع بیان کر دیا ہوتا، اور پھر ہمارے مورخین کی یہ ایک قدیم عادت چلی آتی ہے کہ دار الحکومت میں بیٹھ کر تواریخ لکھ جاتے ہیں طور موقع پر جا کر تصدیق نہیں کرتے! دوسری وجہ اس واقعہ کے بیان کرنے کی یہ ہے کہ اس بزرگ کا خواب عجیب و غریب نوعیت کا ہے، اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ اس کا خواب خیال کا نتیجہ ہے، تو پھر بھی اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ

اس نے قبر کو کھود کر ہڈیوں کا ڈھانچہ نکالا اور دھڑ سے سر غائب دیکھا، جو اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ سلطان شہید[1] کو قتل کیا گیا تو دشمن اس کا سر لے کر بھاگ گئے ہوں یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سر غزنین میں دفن کیا گیا ہو اور دھڑ یہاں۔ یہ تو رواج کے خلاف بات ہے۔ بہرحال دھڑ کا یہاں موجود ہونا اس طرف نگاہ کو منتقل کروا دیتا ہے کہ اغلب یہی ہے یہ سلطان شہید ہی کا دھڑ ہو اور انھیں کا مرقد ہو جو زمانے کے نامساعدت حالات کی وجہ سے منہدم ہو گیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اب اس مختصر سی داستان کے بعد آیئے ذرا دیکھیں کہ سلطان شہید نے پُل کون سی جگہ بنانے کا حکم دیا تھا۔ یہ امر واقعی ہے کہ پُرانے زمانے کے حملہ آور جب کوہستان سرحد کو عبور کر کے پنجاب کے حدود میں داخل ہوتے تھے تو وہ پہاڑوں کے ساتھ ساتھ چلے آتے تھے کہ قریب تر فاصلہ یہی تھا۔ شاہراہ سوری بہت بعد کی تعمیر ہے، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اوّل اوّل بابر بادشاہ نے قدیم راہ سے مختلف راستے اختیار کئے اول بار وہی شاہراہ سوری کے نشان کرتا آیا۔ باہر سے تمام حملہ آور اسی قدیم راہ سے آتے تھے جس پر سلطان شہید چلا تھا اصل راستہ کچھ یوں ہوا کرتا تھا۔ دریائے سندھ کو بمقام ہنڈ عبور کیا جاتا۔ اور اس کے کنارے کنارے پیچھے کے علاقہ میں دریائے سندھ کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ تربیلا پہنچتے اور وہاں سے قریب ہی ہری پور (ہزارہ) سے ہو کر ٹیکسلا پہنچتے۔ یہاں سے براہ گولڑہ اور نور پور سیداں (بری امام کا مقام) ہوتے ہوئے کوہ مری کے پہاڑوں کے دامن میں بجانب پھروالہ چلے آتے، یہاں گکھڑوں کا مشہور قلعہ تھا۔ یہاں سے کہوٹہ آتے اور منکیالہ سے ہو کر ضلع جہلم میں داخل ہوتے اور دھمیک پہنچ کر سلطان پور سے ہوتے ہوئے جہلم دریا کو عبور کرتے۔ اس کے بعد سرائے عالمگیر

---

[1] ڈاکٹر محمد مسعد اللہ چغتائی صاحب نے مطلع فرمایا ہے کہ اس موضوع پر ان کا ایک مقالہ معارف اعظم گڈھ سے ۱۹۴۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ہماری نگاہ سے یہ مقالہ نہیں گذرا البتہ یہ معلوم ہے کہ اس مضمون کے لکھے جانے تک ڈاکٹر صاحب موصوف نے مقام دھمیک نہیں دیکھا تھا۔

پہنچ کر لاہور کا رخ کرتے۔ ذیل کا نقشہ یہ راستہ سمجھنے میں مدد دے گا۔ یہ بھی قدیم شاہراہ جو شارع عام تھی شاہراہ سوری سے پیشتر۔

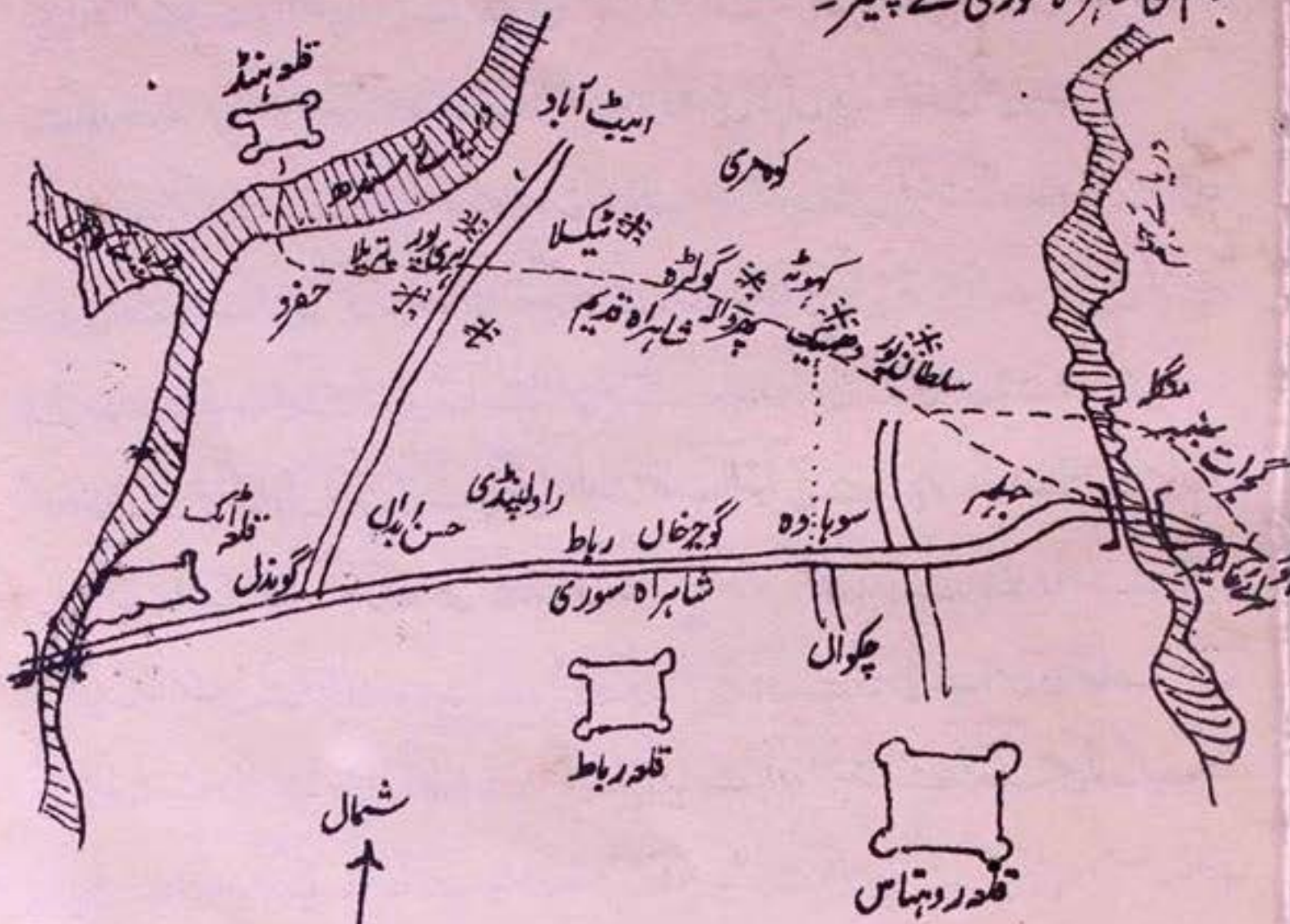

[* یہ علامت ہے پرانے قلعوں کی جو شیر شاہ سوری سے پہلے کے بنے ہوئے ہیں۔ قدیم شاہراہ پر تمام قلعہ جات موجود تھے جن کے آثار آج کل بھی ملتے ہیں۔ جس قدر مغل اور پٹھان بادشاہوں کے قلعے اس راہ پر ہیں یعنی اس علاقے میں وہ تمام شاہراہ سوری کے جنوب میں ہیں یہ بہت بعد کے تعمیر شدہ ہیں تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہمارا مقالہ THE DEVELOPMENT OF MILITARY ARCHECTURE IM PAKICTAN مطبوعہ پاکستان کوارٹرلی بابت دسمبر ۱۹۵۵ء]

چنانچہ پل کی تعمیر کا جو کام تھا وہ کہیں جہلم کے قرب ہی میں تھا اور یہ اُس جگہ پر ہونا چاہیے جہاں آج کل سلطان پور واقع ہے یہی قدیم شاہراہ تھی جہاں دریائے جہلم عبور کیا جاتا تھا۔ دوسرا مقام جہاں پل تیار کیا جا سکتا تھا وہ کچھ شمال کی طرف ہٹ کر ہو گی کیوں کہ سلطان پور پہنچنے کے بعد یہ قدیم شاہراہ دریا عبور کر کے منگلہ کے پاس سے ہوتی ہوئی بھنبر (آزاد کشمیر) پہنچتی تھی اور وہاں سے

گجرات ہوتی ہوئی لاہور چلی جاتی تھی۔ بھمبر سے ایک قدیم راستہ کشمیر کو نکل جاتا تھا اور اکثر مغل بادشاہ یہی راہ کشمیر جانے کی اختیار کرتے رہے ہیں۔ لہذا دھمیک اس قدیم شاہراہ پر واقع تھا۔ ورنہ ادھر سے گذرنا بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ دریائے جہلم پر موجودہ ریل کا پل بہت بعد کی تعمیر ہے۔

اب ہم کچھ دیر کے لئے پھر اصل موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ فرشتہ کے علاوہ اور کسی معاصر مورخ نے یہ بات نہیں لکھی کہ سلطان شہید کو غزنیں لے جاکر دفن کیا گیا تھا۔ منتخب التواریخ اگرچہ طبقات سے بہت بعد کی تصنیف ہے لیکن مستند ہے، بدایونی نے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا کہ سلطان غوری کی لاش کو غزنیں لے جایا گیا۔ البتہ منتخب التواریخ سے دو باتوں کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ایک تو یہ کہ لفظ "کہکر" کو اس نے صاف طور پر "کہوکہر" لکھ دیا ہے۔[1] دوسرے مقام دھمیک کو انھوں نے ذرا وضاحت سے لکھنے کی کوشش کی ہے، جس سے اس کی مختلف شکلوں[2] کا سوال مٹ جاتا ہے۔ بعض جگہ اسے دھمک کہا گیا ہے، اور فرشتہ اسے رتہک بھی لکھ گیا ہے۔ بدایونی نے اسے دمیک لکھا ہے۔ یہ موجودہ نام کے قریب تر ہے، اگرچہ بالکل صحیح نہیں۔ اصل نام وہی ہے جو ہم نے اختیار کیا ہے، یعنی دھمیک

اب ایک آخری بات جو مقام دھمیک کے تعین کے لئے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ دریائے جیحوں اور آبِ نیلاب اور دریائے جہلم ایک ہی دریا کے تین نام ہیں جیسا کہ اوپر وضاحت کر دی گئی ہے اور فرشتہ اور طبقات کے اقتباس سے ذیل کے ٹکڑوں سے بھی یہ بات پیدا ہوتی ہے۔

(۱) برکنار آب جیحوں نزول نماید و پل مہیا دارد۔

(۲) سلطان بتاریخ دوئم شعبان سال مذکور بکنار آب نیلاب رسید و در منزلے کہ برمہیک (دھمیک) اشتہار داشت فرود آمد۔

---

[1] بحوالہ منتخب التواریخ قلمی نسخہ (مصور) از کتب خانہ مرزا حیدر شکوہ۔ یہ نسخہ گیارہویں صدی ہجری میں لکھا گیا

[2] مختلف ناموں کے لئے ملاحظہ فرمایئے ڈسٹرکٹ گزٹیر جہلم۔

اور چونکہ دھمیک نیلاب پر واقع تھا اس لئے حتماً یہ جہلم ہی ہوا۔ گویا یہاں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ دریائے نیلاب ہی دریائے جہلم بھی ہے۔

سلطان شہید کی تدفین کے بارے میں ہم قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے، ہمارے پاس دو روایات ہیں ایک تو فرشتہ کی اور دوسرے اس بزرگ اور مزار کی جو ہم نے خود دھمیک کے قریب دیکھے۔ اس کے متعلق تصدیق اسی طرح ہو سکتی ہے کہ یہ پتہ چل جائے کہ سلطان شہید کا مقبرہ غزنین میں موجود ہے۔ اگر وہاں کوئی آثار نہ ہوں تو پھر اس دھمیک والے مزار پر غور کرنا پڑتا ہے، محققین کے لئے ایک اہم مسئلہ ہے اگر وہ اس کی تہہ کو پہنچ جائیں۔

تفسیر مظہری

عربی کی ایک لاجواب تفسیر

تفسیر مظہری اپنی غیر معمولی خصوصیات کے لحاظ سے بہترین تفسیر سمجھی گئی ہے۔ اس عظیم الشان تفسیر کے مطالعہ کے بعد تفسیر کی کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں رہتی، اس میں وہ سب کچھ ہے جو دوسری تفسیروں میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے، مدلول کلام الٰہی کی تسہیل و تفہیم، تاریخی واقعات کی تحقیق و تدقیق، احادیث کے استقصار، احکام فقہی کی تفصیل و تشریح اور لطائف و نکات کی گل پاشی میں "تفسیر مظہری" کے درجہ کی کوئی کتاب عربی زبان میں موجود نہیں، امام وقت حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی کے کمالاتِ علمی کا یہ عجیب و غریب نمونہ ہے۔ الحمد للہ کہ اب اس بے مثال تفسیر کی تمام جلدیں طبع ہو گئی ہیں۔ قیمت تا بحدِ امکان کم سے کم رکھی گئی ہے۔ پوری کتاب کی دس عظیم جلدیں ہیں۔

ہدیہ غیر مجلد:۔ جلد اول سات روپے، جلد ثانی سات روپے، جلد ثالث آٹھ روپے، جلد رابع پانچ روپے، جلد خامس سات روپے، جلد سادس آٹھ روپے، جلد سابع سات روپے، جلد ثامن سات روپے، جلد تاسع پانچ روپے، جلد عاشر پانچ روپے، ہدیہ کامل چھیاسٹھ روپے۔ رعایتی ساٹھ روپے۔